سید عابد علی عابد

عبّاسی تہذیب میں ہندی عناصر

ظاہر ہے۔ کہ ابتدا میں عربوں کی تہذیب، اگرچہ ملحقہ عظیم الشان سلطنتوں سے متاثر ضرور ہوئی۔ لیکن اس کی اصل و بنیاد عربی ہی تھی۔ بنو امیہ کے زمانے میں کشور کشائی کی طرف توجہ تو رہی۔ لیکن مختلف تہذیبوں کے اختلاط نے ابھی ایک نئی ثقافتی صورت پیدا نہیں کی تھی۔ البتہ خلافت عباسیہ کے زمانہ میں اسلامی سلطنت کی حدود دُور تک پھیل گئیں۔ اور عباسی تہذیب کی تشکیل میں بھی غیر عربی عناصر کارفرما ہونے لگے۔ مصر، شام، ایران ماوراء النہر کے لوگ مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنی قومی تہذیب سے بیگانہ نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ دوسری قوموں کے لوگ بھی جو مفتوح و مسخر نہیں ہوئی تھیں۔ اسلامی ممالک میں بڑی کثرت سے آباد تھے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ عرب جو دُوسری قوموں کی عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ یا کنیزیں بنا کر انھیں اپنے گھر لے آتے تھے۔ ان سے ایک نئی نسل پیدا ہو رہی تھی۔ جو ظاہر ہے۔ کہ علم الحیات کے قانونِ توارث کے مطابق والدین کی صفات سے بہرہ یاب ہوتی تھی۔

عام طور پر مشہور ہے۔ کہ دو قوموں یا نسلوں کے ازدواجی اختلاط سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے۔ وہ ذہین اور فطین ہوتی ہے۔ جہاں اس اختلاط اور ازدواج سے تہذیبوں اور قومی خصوصیات کا تال میل وجود میں آیا۔ وہاں کشمکش بھی پیدا ہوئی۔ چنانچہ عربوں اور موالی کی کشمکش تاریخ میں مشہور ہے۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد بنو عباس کے زمانہ میں بھی تہذیبوں اور اقوام کے اختلاط کے ساتھ ساتھ کشمکش کا عمل بھی جاری رہا۔ چنانچہ شعوبیہ بنو عباس کے زمانے میں یہ دعویٰ کرتے تھے۔ کہ مختلف اقوام میں عربوں کا مقام سب سے کمتر ہے۔ وہ تمام لوگ جنھوں نے کسی نہ کسی صورت میں عربوں کے ہاتھوں صدمے اُٹھائے تھے۔ اس گروہ کی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ ایرانی اکثر و بیشتر شعوبیہ کے ہم خیال تھے۔ جب بنو عباس کے زمانے میں ایرانیوں کا اقتدار بڑھا۔ تو شعوبیہ نے بھی زور پکڑا۔ ادھر دوسرے ممالک سے کنیزیں اس طرح گروہ در گروہ اسلامی ممالک میں آئیں۔ کہ کائنات ہی بدل گئی۔ یہ کنیزیں، اُمرا وزرا، اور خلفا سب کے گھروں کی زینت ہوتی تھیں۔ کئی بادشاہ کنیزوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ کنیزوں کی کثرت اور اور تنوع نے بھی عجیب قسم کی حالت پیدا کر دی تھی۔ یہی نہیں کہ کنیزوں کے بطن سے ایک نئی نسل وجود میں آ رہی تھی۔ بلکہ رُومی، حبشی اور ہندی کنیزوں کے ذریعے ان ممالک کا تمدّن بھی اسلامی ممالک میں اور عرب میں سرایت کر رہا تھا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ عصر عباسی نے نسلیں اور قومیں، تہذیبیں اور تمدّن، رسوم اور رواج، تصوّرات اور افکار، گویا ایک کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈال دیئے تھے۔ ان تمام اجزا کے تال میل سے ابھی ایک نئے ثقافتی نظام کو پیدا ہونا تھا۔ کتاب الاغانی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کنیزوں کو نہایت اہتمام سے علوم مجلسی کی تربیت دی جاتی تھی۔ موسیقی کے رموز پر بھی انھیں مطلع کیا جاتا تھا۔ اور تاریخ میں بار بار کنیزوں کی خوش گلوئی اور خوش اخلاقی کا ذکر آتا ہے۔ ضحی الاسلام کا خیال ہے، کہ یہی کنیزیں جو باہر سے

آتی تھیں۔ اسلامی ممالک میں اور عرب میں موسیقی، مصوری، گھر کی آرائش اور بزم داری اور محفل آرائی کا شوق اور ان چیزوں کے اسباب پیدا کرتی تھیں۔ عباسی عہد کے ریشمی اور حریری پیراہن، آستینوں کے نقش و نگار، دامن اور پیراہن پر خوبصورت اشعار کی تسوید، گھروں کی دیواروں پر نقش و نگار کے ساتھ، اشعار کا لکھا جانا، خطاطی، کوزہ گری اور اسی قسم کے دوسرے ہنر یا تو ان کنیزوں کے ذوقِ جمال کا نتیجہ تھے۔ یا مختلف نسلوں اور قوموں کے میل جول سے پیدا ہوئے تھے۔

عصرِ عباسی میں جو نئی تہذیب مختلف قوموں کے میل جول سے اُبھری ہے۔ اسکے بنیادی اجزا تفصیل ذیل ہیں:

(۱) ایرانی تہذیب اور تربیت۔

(۲) ہندی افکار اور تصورات اور تہذیب و تمدن کے کچھ پہلو۔

(۳) یونان اور رُوم کی تہذیب اور بالخصوص یُونانی فلسفے کے اثرات۔

(۴) عربوں کی تہذیب (بدوی اور حضری)

آج ہندی تہذیب و تربیت اور تصوّرات و افکار سے بطریق اجمال بحث کرتا ہوں۔ کہ یہ داستان دراز ہے۔ اور

"افسانہ از افسانہ می خیزد"

جاہلیت کے زمانہ میں بھی عرب ہندوستان سے اور یہاں کی تہذیب کی قدامت سے آگاہ تھے۔ دونوں قوموں کے درمیان تجارتی روابط بھی قائم تھے۔ جہاز اور کشتیاں بھی برابر آتی جاتی تھیں۔ سید سلیمان ندوی نے "عرب اور ہند کے تعلقات" میں دونوں قوموں کے تال میل کی قدامت سے تفصیل بحث کی ہے۔ ہندوستان سے جو چیزیں برآمد کی جاتی تھیں۔ ان میں عودِ ہندی یا عودِ قماری بہت مشہور تھی۔ ہندوستان میں تلواروں کی بھی بڑی مانگ تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں تلوار کے بننے کے عمل کو "تہنید" کہتے تھے۔ عرب میں عورتیں اکثر اپنا نام "ہند" رکھتی تھیں۔ (یہ بات تحقیق طلب ہے۔ کہ ہند[1] کا نام ہندوستان کی محبت کی وجہ سے اتنا مقبول تھا یا کوئی اور وجہ تھی) عراق اور ایران کی تسخیر کے بعد ہندوستان کی فتح کے منصوبے بھی عرب باندھنے لگے۔ چنانچہ بلاذری لکھتے ہیں۔ کہ جب حضرت عثمانؓ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے تو انھوں نے ہندوستان کے حالات سے آگاہ ہونے کے لئے ایک شخص حکیم نامی کو ادھر بھیجا۔ روایت ہے۔ کہ جب یہ حکیم واپس آیا۔ تو حضرت عثمانؓ نے اس سے پوچھا، کہ کہئے ہندوستان کی کیا صورت ہے؟ حکیم نے منہ بنا کر کہا: یا امیرالمومنین! وہاں پانی کم ہے پھل خراب ہیں۔ اور چور بڑے جیالے ہیں۔ تھوڑی فوج جائے تو صحراؤں میں گم ہو جاتی ہے۔ زیادہ جائے تو بھوکی رہتی ہے"۔

حضرت عثمانؓ نے کہا کہ باتیں بناتے ہو، یا سچ کہتے ہو؟

حکیم نے جواب دیا: "جو کچھ عرض کرتا ہوں تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں"۔

---

[1] ہند کی پرانی شکل سندھ یا سندھو ہے۔ وائلڈ کا قول ہے، کہ سنسکرت میں سندھ اور سندھو "دریا" ہی کو کہتے ہیں۔ س اور ھ کا تبادلہ عام ہے۔ جیسے "ہور" کہ سورج کو کہتے ہیں۔ اور "سوریہ" اس کی عام شکل ہے۔ یہاں بھی ھ، س سے بدلی ہے۔

ولید کے زمانہ میں (۸۶ھ سے ۹۶ھ تک) محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا۔ اور راجہ داہر کو شکست دیکر شہر اور قلعے فتح کرتا ہوا ملتان تک آپہنچا۔ عباسیوں کے زمانے میں بھی عربوں کے تعلقات سندھ سے قائم تھے۔ جو لوگ سندھ سے غلام ہوکر لائے گئے ان میں ایک شخص زیاد سندھی بھی تھا۔ جس کا لڑکا ابن الاعرابی لغت کا بہت بڑا عالم تسلیم کیا جاتا ہے۔ سندی نژاد محدثین میں ابو معشر کا پایہ خاصا بلند ہے۔ جو کتاب المغازی کے مصنف ہیں

سندھ کے لوگوں نے عربی ادب کا مطالعہ بھی کیا اور دوسرے اسلامی علوم و فنون بھی حاصل کئے۔ ادھر عرب میں جو سندھی غلام آئے تھے ان کے متعلق جاحظ کی روایت یہ ہے کہ بصرے میں ہر صراف کا خزانچی سندھی ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھی خوش معاملہ، وفادار اور مالی معاملات میں محتاط تھے۔ سندھ کی فتح سے (بالخصوص عہد عباسی میں جب مسلمان وہاں جا جا کے آباد ہونے لگے) ہندی تصورات و افکار کی اشاعت عرب میں شروع ہوگئی۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ عہد عباسی میں جب ایرانی برسر اقتدار آئے۔ اور وزارت کا منصب بیشتر انہی سے مخصوص ہوگیا۔ تو ایرانی ثقافت اور افکار و تصورات عربوں کی زندگی میں سرایت کر گئے۔ یہ ایرانی افکار و تصورات حقیقت میں ہندی افکار و تصورات اور علوم و فنون سے بہت متاثر تھے۔

ہندوستان سے ایران کے تعلقات ظاہر ہے کہ بہت قدیم تھے اور جونہی ایرانی عہد عباسی میں برسر اقتدار آئے تو ایرانی تہذیب و ثقافت کے بہت سے پہلوؤں کا گہرا رنگ عربوں کی زندگی پر چڑھ گیا۔ اس رنگ میں ہندی رنگ ایرانیوں وساطت سے بھی آیا تھا۔ لیکن بلا واسطہ بھی عرب ہندی تہذیب و تمدن (طلوع اسلام سے پہلے) متاثر ہوتے رہتے۔ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے۔ کہ آج سے دو اڑھائی ہزار برس قبل عربوں اور ہندوستانیوں میں تجارتی روابط قائم ہوگئے تھے اور جہازرانی کی عربی اصطلاحات بحری تجارت کا ثبوت ہیں۔ جو چیزیں ہندوستان سے خصوصیت سے برآمد کی جاتی تھیں۔ ان کے لئے عربی، ہندی اور اردو الفاظ ملاحظہ فرمایئے:۔

عربی	ہندی	اردو	عربی	ہندی	اردو
صندل	چندن	صندل	اطریفل	تری پھل	اطریفل
تنبول	تنبول	پان	نارجیل	ناریل	ناریل
کافور	کپور	کافور	انبج	آم	آم
قرنفل	کرن پھل (کلنک پھل)	لونگ			

قرآن مجید میں بھی مسک (مشک)، زنجبیل (ادرک) کا ذکر آیا ہے۔ نارنگی بھی ہندوستانی ہے۔ کہ عربی میں نارنج کہلاتی ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ ہندوستان سے ہاتھی دانت یاقوت، جائفل، سیاہ مرچ، زعفران اور الائچی بھی برآمد کی جاتی تھی۔ سید سلیمان ندوی مدعی ہیں کہ تورات کی شہادت کے مطابق بھی عربوں اور ہندوستانیوں کے تجارتی تعلقات کم از کم

دو ہزار سال پُرانے ہیں۔ زعفران نے تو اسلامی ممالک میں ایسا مقام حاصل کیا کہ باید و شاید۔

یہ مسئلہ جُدا ہے۔ کہ عہدِ عباسی میں مختلف تہذیبوں کے اختلاط سے جو تہذیب پیدا ہوئی۔ اُس میں ہندی عنصر کی اہمیت کتنی تھی لیکن ہندی عناصر کی موجودگی اور اہمیت سے انکار کرنا مشکل ہے۔

مُسلمان، عربی علماء اس بات کے قائل تھے۔ کہ علم نجوم، حساب، طب، خطّاطی، اور تصویر کشی میں ہندی ممتاز ہیں۔ مسعودی کا قول ہے۔ کہ "پرانے وقتوں سے ہندوستان حکمت اور فلسفے کا سرچشمہ رہا ہے۔ کالی چمڑی رکھنے والی قوموں میں ہندو، عقل و خرد، سیاست و حکمت، تندرستی، اصابت رائے اور نقش و نگار کے تیکھے پن کی وجہ سے ممتاز نظر آتے ہیں"۔

اصفہانی "محاضرات الادبا" میں کہتا ہے۔ "ہندی علم حساب میں، طب میں، سنگ تراشی میں، موسیقی میں اور شطرنج میں کھیلنے میں مشاق تھے"۔

الٰہیات میں ہندوستانی مفکروں کا جو مقام تھا۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس سلسلے میں ہندی فلسفیوں نے ایسے ایسے دقیق اور پیچیدہ نکتے پیدا کئے ہیں۔ کہ باید و شاید۔ فلسفے میں ہندیوں کو اہلِ یونان کے برابر گنا جاتا تھا۔ بہت عرصہ یہ بحث چلتی رہی۔ کہ آیا یونانیوں نے فلسفہ ہندیوں سے سیکھا ہے یا ہندیوں نے یونانیوں سے۔ ویدانت اور اس کے متعلقہ مسائل آج تک دانشوروں کے لئے سرمۂ بینش بنے ہوئے ہیں۔ ہندی الٰہیات میں ایک چیز نمایاں تھی۔ یعنی کثرت میں وحدت۔ اس کی صورت یہ تھی کہ برہمہ جو اصل حقیقت ہے اور ماورائی کائنات ہے۔ تین دیوتاؤں یا صفات کے ذریعے اپنے احکام کی تعمیل کرواتا ہے۔ وہ تین دیوتا وشنو، شِو اور برہما ہیں۔ جن کی مورتی اب تک ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ اِس کے مقابلے میں عربوں نے وحدتِ محض اور وحدتِ بسیط کا جو تصوّر پیش کیا تھا۔ وہ ہندی الٰہیات سے یوں برتر تھا کہ ہندی حقیقت کو نہ صرف پارہ پارہ کر کے دیکھتے ہیں۔ بلکہ ان کا ایک قالب ثانی بھی تلاش کرتے ہیں تصوّف میں "کثرت میں وحدت" کا مسئلہ خوب پھلا پھولا۔ لیکن مذہب اسلام نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ حقیقت کو قالبِ مجازی کے ذریعے ڈھونڈا جائے۔ تصوّف میں مجاز و حقیقت کے یکرشتے ہیں حسنِ مجاز کے ذریعے حسنِ حقیقی تک پہنچنے کا طریقہ اکثر صوفیوں کے ہاں قبول ہے (اگرچہ سعدی بار بار اہلِ تصوّف کو اس روش سے روکتا ہے) حقیقت میں ہندو برہمن تصوّف کے پیرِ مغاں کے رُوپ میں ظاہر ہوا ہے۔ جس طرح ہندو عوام برہمنوں کے آگے بے بس تھے اسی طرح مرید بھی اپنے مرشد یا پیرِ مغاں کے آگے بے بس ہے۔ وہ کہے تو سجادہ[1] رنگین کرنا ہی پڑتا ہے اور نظر[2] کامل ہو تو حسنِ خوباں کے جلوے دیکھنے ہی پڑتے ہیں۔

ویدانت میں جو تثلیث کی اہمیّت ہے وہ عیسائیوں کے ہاں بھی قائم ہے۔ چنانچہ ان کی تثلیث ماں، بیٹا اور روح القدس

۱؎ بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

۲؎ پیرِ ما را ز فراست نظرے کامل بود — کہ مرا توبہ نہ از دیدنِ خوباں دادست

پر مشتمل ہے۔ تین کا عدد عجب پُراسرار عدد واقع ہوا ہے۔ کہ جب تصوّف کے افکار و تصوّرات نے نشو و نما پائی۔ تو خُدا کی حقیقت کو تین پہلوؤں سے سمجھنے کی کوشش کی گئی :

(۱) حق مطلق ۔
(۲) خیرِ مطلق ۔
(۳) حسنِ مطلق ۔

اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہی تینوں پہلو ادب، انتقاد، ذہن اور رُوح کی دُنیا میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ نقاد کہتے ہیں کہ حسن، صداقت اور حقیقت ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ ایرانی ادب میں نیکو کے معنی حسین کے بھی ہیں۔ اور خُوب کے بھی۔ چنانچہ نیکوئی، خوش اخلاقی کو بھی کہتے ہیں۔ اور حُسن کو بھی۔ اور ظاہر ہے کہ نیکی کو تو کہتے ہی ہیں۔ نیکو کی جمع ہے نیکوان۔ لیکن نیکو کار، خوش اخلاق اور اُس آدمی کو کہتے ہیں۔ جو گناہوں سے بچتا ہو۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً آریائی زبانوں میں فارسی سب سے شائستہ زبان ہے۔ کہ اس نے ابھی تک صداقت، نیکی اور حُسن کی ہم آہنگی کو ایک کلمے کے ذریعے قائم رکھا ہے۔

ویدانت کا ایک پہلو جو آہستہ آہستہ عجمی تصوّر میں داخل ہو کر اسلامی تہذیب کا جزو بن گیا۔ نہایت مہلک اور خطرناک تھا اور ہے یہ وہی تصوّر ہے۔ جس نے مختلف مرحلوں سے گزر کر آخر کار وحدتِ وجود کی شکل اختیار کی ہے۔ اور جس کا مفہوم یہ ہے کہ اصل وجود صرف خدا ہے۔ کائنات اور اُس کے تمام مظاہر اضافی اور اعتباری ہیں لیکن ان میں خالق کائنات کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس لئے ہر چیز گویا جزوِ حقیقتِ خداوندی ہے۔ منصور حلاّج نے جو "انا الحق" کہا تھا۔ اس کا جواز اس کے پاس یہی تھا، کہ میں حقیقتِ مطلقہ کا جُزو ہوں۔ اور اسی اعتبار سے خود بھی حق ہوں۔ وحدتِ وجود کے مقابلے میں وحدت شہود کا نظریہ پیش کیا گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ پہلے نظریئے سے ذہن و فکر میں جو کجی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا ازالہ کیا جا سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر وحدتِ وجود ہی کا نظریہ مقبول رہا اور اپنی تمام ہلاکت آفرینیاں تصوّف کے شیرین اشعار کے ذریعے بکھیرتا رہا۔ اقبال نے شنکر اچاریہ اور منصور کا گویا ایک ہی سانس میں نام لیا ہے۔ گلشن راز، جدید میں پہلے اقبال اس فریبِ خیال کا ذکر کرتا ہے۔ جو ویدانت کا اساسی عنصر ہے (اور مزے کی بات یہ ہے کہ رمزِ "انا الحق" کا ذکر ہو رہا ہے) ۔

مقامِ تحت و فوق و چار سو خواب — سکون و سیر و شوق و جستجو خواب
دلِ بیدار و عقلِ نکتہ بین خواب — گمان و فکر و تصدیق و یقین خواب
ترا این چشم بیدارے بخواب است — ترا گفتار و کردارے بخواب است

چو او بیدار گردد دیگرے نیست
متاعِ شوق را سودا گرے نیست

اس کے بعد یہ پوچھتا ہے۔ کہ اگر حیات فریب و خیال اور وہم و گمان ہے۔ تو پھر جس شخص کو یہ وہم ہو رہا ہے۔ جو شخص مبتلائے

گمان ہے۔ وُہ کون ہے؟ اس کے بعد اقبال کہتا ہے:

وجودِ کوہسار و دشت و در ہیچ! جہان فانی، خودی باقی، دگر ہیچ!
دگر از شنکر و منصور کم گوئے! خدا را ہم براہِ خویشتن جوئے!

بخود گم بہرِ تحقیقِ خودی شو
انا الحق گوئے و صدیقِ خودی شو

علامہ اقبال مرحوم نے جو منصور حلاج اور شنکر آچاریہ کا گویا ایک ہی سانس میں نام لیا ہے۔ اس کی معقول وجوہ ہیں۔ حلاج کی زندگی کے واقعات دسویں صدی عیسوی سے مربوط ہیں۔ اس کا ایرانی الاصل ہونا مسلم ہے لیکن وطنِ مالوف کے متعلق شدید اختلافات ہیں۔ یہ بھی مسلم ہے کہ سیر و سیاحت کے دوران میں وُہ ہندوستان بھی آیا ہے۔ صاحب الفہرست اس سے ۴۶ کتابیں منسوب کرتے ہیں۔ عام طور سے یہ بھی کہا جاتا ہے[1] کہ وہ رجعت حلول اور تناسخ کا قائل تھا۔ اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جب وُہ ہندوستان آیا ہے۔ اس وقت شنکر آچاریہ[2] کی تعلیمات کا بہت زور تھا۔ کیونکہ خود یہ جگت گرو نویں صدی عیسوی سے متعلق ہے۔ ویدانت کے تصورات و افکار کے ساتھ بدھ کی تعلیمات بھی (بہت قدیم زمانے سے) ان ممالک میں منتشر ہو رہی تھیں جو عرب کے ہمسائے تھے اور جو بعد میں عربوں نے مسخر و مفتوح کر لئے۔ وسط ایشیا، چین اور ترکستان میں بدھ مت کا زور بہت دیر تک قائم رہا۔ (اب تک قائم ہے)۔ منگولوں کے قبیلے اگرچہ مذہبی معاملات میں سخت متعصب تھے۔ لیکن کئی منگول شہزادوں نے بدھ مت اختیار کر لیا تھا۔ یہ تو خیر بہت بعد کی بات ہے۔ عہدِ عباسیہ کے آغاز سے بہت پہلے بلخ اور بخارا میں بدھ کے معبد یا دہار قائم تھے۔ ان کو ایرانی بہار کہتے تھے اور فرخی ایک قصیدے میں نوبہار کا ذکر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بدھ مت کے مقلدوں کا تو تعمیر کردہ معبد یا وِہار ہے۔ وِہار وہی لفظ ہے جو ہندوستان کے اس صوبے کا نام ہے جو بدھ مت سے خاص تعلق رکھتا ہے یعنی بہار (Bihar) معبد اور بتکدے کے معنی میں بھی لغات اس کلمے کو بہار بالفتح پڑھتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے اور خود کلمہ نوبہار پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اصل کلمہ بہار، بہ کسر حرف اوّل ہے۔ اور ی کے ساتھ جو یائے ہے وُہ ب کے کسرے کو کھینچ کر دکھا رہی ہے۔ بہار کا اب، بدھوں کا معبد ہونا بالکل مسلم ہے۔ سید سلیمان ندوی بھی اسی نتیجہ پہ پہنچے ہیں اور ایران کی مطبوعہ لغت برہان[3] قاطع کے فاضل مدیر بھی آل برمک جنھوں نے عباسیوں کے عہدِ حکومت میں بہت جاہ و جلال اور طمطراق سے، وزارت کی ہے اصلاً بدھ مت کے پیرو تھے اور ان کا مورث برمک (سنسکرت پرمک) بلخ کے وہار کا پروہت تھا۔ آل برمک کی وزارت

۱؎ دیکھئے، براؤن، تاریخ ادبیات ایران۔ جلد اوّل۔ حلاج کے مسلک کے متعلق کچھ اشارات اسرار التوحید فی مقامات شیخ ابی سعید میں بھی ملتے ہیں۔ (تالیف محمد منوّر بن ابی سعید بن ابی طاہر بن ابی سعید ابوالخیر) اس کی تالیف کا سن غالباً ۵۶۰ ہجری ہے۔ (شفق۔ تاریخ ادبیات ایران ۲۳۳

2. A short History of India by W. H. Moreland, Longmans Green, 1936.

۳؎ برہان قاطع۔ بہ اہتمام محمد معین (الف تا ث) کلمہ۔ بہار۔ بہشت گنگ۔ (طہران شمسی ۱۳۳) مزدیسنا تالیف محمد معین بھی دیکھئے۔ (صفحہ ۳۲۵)۔

کے زمانے میں اسلامی ممالک اور ہندوستان کے علمی تجارتی اور ثقافتی روابط ظاہر ہے کہ زیادہ ہو گئے لیکن آل برمک کے برسر اقتدار آنے سے پہلے بھی بدھ مت کا دھیان گیان اور تپسیا، اسلامی ممالک میں ریاضت اور مجاہدے کی شکل اختیار کر کے پہنچ چکا تھا۔ باقی رہے تناسخ، حلول اور رجعت کے مسائل تو بہت سے ایرانی فرقے جو کبھی ابو مسلم خراسانی کے خون کے دعوے دار ہوتے تھے اور کبھی المقنع (خراسان کا نقاب پوش پیغمبر) کے تابع فرمان ہوتے تھے ان تینوں چیزوں کے قائل تھے۔[1] اور بہت سے مسلمان مورخوں کا دعویٰ ہے کہ المقنع بہ تخصیص کہتا تھا کہ میں خدا کا اوتار یا روپ ہوں۔ بہ الفاظ دیگر (معاذ اللہ) ذاتِ خداوندی اس میں حلول کر گئی تھی۔

ضحی الاسلام[2] کا دعویٰ ہے کہ تناسخ کے تصور نے اسلامی تہذیب اور افکار و تصورات کو بہت متاثر کیا ہے۔ تناسخ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ روح انسانی غیر فانی ہے اور اگر انسان اس دنیا میں نیک کام کریگا تو بتدریج اس کی روح کمال و ارتقا کے منازل طے کر کے آخر جسم کی قید سے آزاد ہو جائیگی۔ یعنی اس پر مجبور نہ ہو گی کہ جسم کا چولا پہنے۔ یہی آزادی۔ روح کا قید جسم سے نکل جانا اور ماورائے حقیقت، روح جاودان سے جا ملنا نروان ہے۔ (بدھ کے عقیدے کے مطابق) جو لوگ بُرے کام کرینگے ان کی روحیں، حشرات الارض اور جانوروں کی شکلیں اختیار کرینگی تا اینکہ وہ بھی نادم ہوں۔ نیکی کی طرف مائل ہوں اور اس چکر سے چھوٹیں۔ تناسخ کے حامیوں نے اس عقیدے کے سلسلے میں بہت موشگافی کی ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ تناسخ کے چار مقامات ہیں: (۱) نسخ۔ (۲) مسخ۔ (۳) رسخ۔ (۴) فسخ۔

ان مقامات[3] کی تفصیل و تشریح اس مضمون کے دائرہ سے خارج ہے۔

تناسخ حلول اور رجعت کے تصورات و افکار، صرف بدھ مت کے مبلغوں کی مساعی کا ثمر نہیں ہیں۔ ایران قدیم کے مفکر! مانی (جسے ادبی روایت مصور تسلیم کرنے پر مصر ہے) نے بھی اسی قسم کے عقاید کا اظہار کیا تھا اور اسلامی ممالک میں یہ عقاید ذرا تغیر و تبدل سے متکلمین کے بعض فرقوں نے، قرامطہ نے اور ابو مسلم کے حامی شیعان غالی نے قبول کر لئے تھے۔ عبداللہ بن سبا کے پیرو اور نصیری بھی ان میں شامل تھے (آجکل دروزی[4] اس عقیدے پر کم و بیش سختی سے قائم ہیں)۔

الف لیلہ داستانوں اور افسانوں پر مشتمل ہے لیکن افسانے اور روایتیں بھی ثقافتی مزاج کا سراغ دیتی ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی تناسخ کے عقیدے کا ذکر ہے۔ یہ قلمبند کیا جا چکا ہے کہ آخر کار روح، کائنات کے چکر سے جدا ہو کر قید جسم سے رہائی پا لیتی ہے۔ اور عاقل و عقل و معقول کا اتحاد کامل وجود میں آتا ہے۔

غالب نے وحدتِ وجود کے سلسلے میں یہ شعر کہے ہیں:

---

[1] تاریخ ادبیات ایران۔ جلد اول صفحہ ۳۲۰۔ [2] ترجمہ کتاب ضحی الاسلام بہ قلم عباس خلیلی موسوم بہ پرتو اسلام، صفحہ ۲۷۱۔

[3] جن کو تفصیلات دریافت کرنے کا شوق ہو وہ ضحی الاسلام کی کتاب۔ ترجمہ عباس خلیلی سے رجوع کریں (حوالہ اوپر آ چکا ہے) صفحہ ۲۷۲۔

[4] مختلف سیاحوں نے انکے حالات جستہ جستہ Druses قلمبند کئے ہیں۔ انکی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کا پیشوا الدوزی تھا جو خلیفہ فاطمی مصر الحاکم کا وزیر تھا حاکم نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ (فاطمہ اور علی کی اولاد ہونے کا دعویٰ پہلے ہی کر چکا تھا) دروزی ابھی تک لبنان میں ملتے ہیں۔

History of Persia by Sykes, Vol. II.

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اور مایا کے متعلق یہ شعر دیکھئے گا:

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

مفتی انوار الحق صاحب نے دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ میں بجنوری نے جو کچھ مسئلہ وحدتِ وجود کے متعلق لکھا تھا اس کا بہت اچھا جواب دیا[۵۱]۔ ضحی الاسلام کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہندوؤں کا ایک مسلک "سمنی" جو سومنات سے منسوب تھا۔ خراسان، عراق اور پارس میں بہت مقبول تھا۔ زرتشت کے ظہور کے بعد اس مسلک کا زور ٹوٹ گیا لیکن عہد عباسیہ تک کچھ عالم خاص طور پر متکلمین اس مسلک کے پیرو رہے۔ اس مسلک[۵۲] کا اساسی خیال یہ تھا کہ جس علم کی بنا حواسِ خمسہ پر قائم نہ ہو۔ اسے علم صحیح نہیں کہہ سکتے۔

آل برمک کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہندوستان سے علمی روابط زیادہ گہرے اور دُور رس ہو گئے۔ انھوں نے ہندوستان کے عالموں۔ پنڈتوں، گنوانوں اور طبیبوں کو بلوایا اور بغداد میں اچھے عہدوں پر متمکن کر دیا۔ اس زمانے میں ہندی علماء نے ریاضی اور ہندسہ کے متعلق اپنی معلومات عربوں تک منتقل کیں۔ سدھانت عربی میں ترجمہ ہوئی۔ ایک سے لے کر ۹ تک رقمیں لکھنے کا اسلوب عربوں نے ہندیوں سے سیکھا اور پھر باقی دنیا کو سکھایا کہ اب تک یہ اعداد[۵۳] عربی کہلاتے ہیں نجوم اور ہیئت میں بھی عربوں نے ہندی علما سے استفادہ کیا اگرچہ یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ دجلہ اور فرات کے درمیان جو میدان ہے وہاں کے بسنے والے علم نجوم کے بہت مشتاق تھے۔ چنانچہ مشہور ہے، کہ منارۂ بابل دراصل رصدگاہ تھا۔ بابلیوں اور نینوا کے لوگوں کے مندر اور ہیکلوں کے درجے بھی ستاروں کے نام پر رکھے گئے تھے۔ ہیئت کی ایک اصطلاح کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو ہندوستان سے آئی۔ اور عرب کی ہو رہی۔ یہ اوج ہے کہ بلندی طالع کو کہتے ہیں۔ اس کی سنسکرت شکل "اُچّ" ہے۔ پنجابی اُچّا۔ اُردو اونچا) ایران والوں کا دعویٰ ہے کہ اس لفظ کی اصلی شکل اوگ ہے اور اس دعوے کی بنا یہی بات ہے کہ ایران میں قدیم سے، نجوم شناسی کا علم بہت مقبول تھا۔ صاحب برہان قاطع لکھتے ہیں:

اَوج[۵۴] - بہ فتح اوّل بر وزن موج، معرب اوگ است کہ مقابل حضیض باشد۔ و بلند ترین درجہ کواکب بود و آں نقطہ ملاقات سطح محدب فلک باشد از افلاک جزئیہ سبعہ سیارہ با حوامل ایشاں۔ و نام نغمہ ایست از موسیقی۔ و بعضے گویند ایں لغت ہندی است[۵۵]

اس طرح علم ہندسہ کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق ہند سے ہے لیکن یہ غلط محض ہے ہندسہ دراصل فارسی اندازہ

---

۵۱ دیوانِ غالب، جدید نسخہ حمیدیہ۔ مرتبہ محمد انوار الحق (صفحہ ۸۴ تا ۹۸ حاشیہ) ۵۲ پرتو اسلام۔ ترجمہ کتاب ضحی الاسلام، بہ قلم عباس خلیلی صفحہ ۲۷۴ ۵۳ Arabic Numerals. ۵۴ برہان قاطع (محمد معین) صفحہ ۱۸۱ -

کی تعریب ہے۔ برہانِ قاطع[1] کی اصل عبارت دیکھ لیجئے:

"اندا چہ ۔ بروزن دریا چہ، بلغت زند ویا زند فکر واندیشہ را گویند"

(حاشیہ: "ہند اختن در پہلوی بمعنی اندازہ گرفتن و حساب کردن است")۔

"اندازہ ۔ بروزن خمیازہ ۔ پیمانۂ ہر چیز را گویند و قیاس کردن و انداز گرفتن ۔ وتعریبش بہ ہندسہ کردہ اند وبمعنی قدرت وقوت ہم آمدہ است"۔

ہارون رشید ہی کے زمانے میں (کہ ابھی آلِ برمک برسرِ اقتدار تھے) جب امیرالمومنین کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ہندوستان سے ایک طبیب منکہ نامی بلوایا گیا۔ اس نے کامیابی سے ہارون رشید کا علاج کیا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ ہندوستانی طب کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہونے لگیں۔ ان میں سب سے اہم شسترت تھی۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ سانپوں اور ان کے زہروں کے متعلق بھی عربوں نے عہدِ عباسی میں ہندوؤں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

سنسکرت کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے، کہ یہ دیوتاؤں کی زبان ہے۔ چنانچہ جب اس زبان کے قواعد صرف ونحو مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی تو کسی عام انسان سے رجوع نہیں کیا گیا کہ اس سے زبان کی توہین ہوتی تھی بلکہ ایک مشہور دیوتا سے مدد طلب کی گئی۔ یہ دیوتا مہادیو ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں بہت بڑا دیوتا۔ نٹ راج بھی اس کا لقب ہے۔ رقص وسرود کا منبع بھی یہی دیوتا ہے۔ (جاحظ کی روایت کے مطابق) ابوالاشعث مسلم نے بھلہ ہندی سے پوچھا کہ ہندوؤں کی نظر میں بلاغت کسے کہتے ہیں۔ بھلہ نے کہا "میں اس فن کا متخصص نہیں ہوں"۔ ابوالاشعث نے بھلہ کی بتائی ہوئی کتاب کے بعض مطالب کا ترجمہ کیا مثلاً:

"بلاغت کا پہلا سرمایہ اسباب بلاغت کا مہیا کرنا ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ خطیب متین ہو۔ باوقار ہو۔ اور عزم راسخ رکھتا ہو۔ تقریر کے وقت، ہاتھ پاؤں سے بہت کام نہ لے۔ ادھر اُدھر نہ دیکھے۔ الفاظ کا اس طرح انتخاب کرے کہ ہر سننے والے کے مناسب حال ہو"۔

اس ٹکڑے[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں بلاغت کی جو ایک خاص ادا ہے کہ "کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو"۔ وہ دراصل سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ تنوخی، ہند وعرب کی بلاغت کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اہلِ ہند مفصل ومطول بات کرتے ہیں اور اہلِ عرب مختصر، بہ غایت ایجاز کہ اعجاز کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ عربوں کے اختصارِ کلام کی یہ مثال دی گئی ہے کہ "دو آدمی اپنے اپنے حسب ونسب پر فخر کر رہے تھے اور اپنی عالی نسبی کا ذکر چٹخارے لے لے کر بیان کر رہے تھے کہ ایک نے دوسرے سے مخاطب ہو کر کہا: "سنتے بھی ہو تم کہاں سے عالی نسب ہو گئے"۔ اس نے جواب دیا کہ "بات یہ ہے، کہ میرے خاندان کی بزرگی اور عالی نسبی مجھ سے شروع ہوتی ہے اور تمہارے خاندان کی عزت، تمہارے ساتھ (تمہاری کرتوتوں کی وجہ سے) ختم ہو گئی"۔

جس ہندی عنصر نے، عہدِ عباسی میں، مسلمانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بے شک وشبہ ہندیوں کا فن داستان گوئی تھا،

---

[1] برہان قاطع (محمد معین) صفحات ۱۶۹ - ۱۶۸)۔ [2] ضحی الاسلام ۔ صفحہ ۲۷۹ ۔

قدیم الایام سے ہندی۔ افسانہ طرازی اور سخن سازی کے لئے مشہور ہیں۔ ان کے افسانوی ادب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ داستانیں تین طرح کی ہیں :۔

(۱)۔ ایسے افسانے یا حکایات جو درحقیقت اخلاقی اسباق سے مملو ہیں۔ کتاب پنچ تنتر جو نوشیرواں کے عہد میں ہندوستان سے ایران پہنچی تھی اس فن کا بہترین نمونہ تھی اور ہے۔ اس کتاب میں جانوروں کی کہانیوں کے ذریعے ایسے حیرت انگیز اور دلپذیر نتائج اخذ کئے گئے ہیں اور پردے پردے میں اخلاقی اقدار کی ایسی تبلیغ کی گئی ہے کہ باید و شاید۔ ایرانی فاضلوں نے اس کا پہلوی میں ترجمہ کیا اور رودکی (متوفی ۳۲۹ ہجری) نے اسے فارسی نظم کے قالب میں ڈھالا۔ ابن المقفع نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ (اس فاضل نے عہد خلافت عباس کے صرف دس سال دیکھے تھے کہ مقتول ہوا۔) یہ کتاب دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور سنسکرت فن داستان سرائی کی وہ ادائے خاص بھی رکھتی ہے کہ کہانی میں سے کہانی پیدا ہوتی ہے۔ اور بہت سی کہانیاں مل کر ایک مجموعی صورت پیدا کرتی ہیں۔

(۲) ایسی داستانیں جو بیش تر صنمیات سے متعلق ہیں۔ اور کسی بزرگ ہستی کی ولادت کے سلسلے میں ان تمام داستانوں کو پھر وہی مجموعی رنگ دیدیا جاتا ہے۔ تاکہ داستان سرائی میں جھول نہ پیدا ہو۔ بوذاسف کی داستان اور متعلقہ کہانیاں اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ بوذاسف، درحقیقت بدھ کا ایک نام ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بدھ سے بوذاسف کا کلمہ کیسے برآمد ہوا۔ جواب یہ ہے کہ بدھ کے مجسموں میں اور بدھ کے متعلق روایات میں، گوتم بدھ کی شخصیت کے دو پہلو دکھلائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہی دھیان گیان میں مگن اور دوسرے ایک کھشتری شاہزادہ، کہ سر پہ مکٹ رکھے، کاندھے پہ کمان ٹکائے، اسباب سیر و شکار و جنگ سے لیس ہے۔ یہ آخری صورت، بدھ ستوا کہلاتی ہے۔ بوذاسف اسی کی ایک صورت ہے۔

(۳) تیسری قسم کی ہندی داستانیں دو ہیں۔ جو اخلاقی یا مذہبی اقدار سے ضمناً بحث کرتی ہیں۔ اور ان کا اصل مقصد ایک قصہ بیان کرنا ہے۔ کالی داس کے ڈرامے، دوسری کہانیاں جو کتھا ساگر میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اور صناعانہ افسانے اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

سنسکرت کی تمام کہانیوں میں، کلیہ و منہ سے لی گئی ہوں یا کتھا ساگر سے، ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر کہانی، کی چول نہایت سلیقے سے بٹھائی جاتی ہے اور جہاں کہانی سے کہانی برآمد ہوتی ہے وہاں اس سلیقے اور خوبصورتی سے کام لیا جاتا ہے کہ باید و شاید۔ الف لیلہ کے متعلق مشہور ہے کہ یہ ان ایرانی کہانیوں کا عربی چربہ ہے جو ہندوستان سے ایران پہنچی تھیں۔ بہرحال حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ الف لیلہ پر سنسکرت کی کہانیوں کا فیض نمایاں ہے۔ ساری کتاب کا دراصل ایک کہانی ہونا، پیچ در پیچ افسانے، جو ایک دوسرے سے برآمد ہوتے ہیں۔ سب سنسکرت کے فن افسانہ سرائی کی یاد دلاتے ہیں۔ بہرحال اب الف لیلہ جس شکل میں ہے عربوں کا مال ہے کہ اس میں عہد عباسی کے خلفا ان کے زمانے کی معاشرت، اور ان کے عہد کے بعض زعما کی ایسی خوبصورت تصویریں کھینچی گئی ہیں کہ باید و شاید۔ کہیں پر وہ افسانے کا قائم